رسائل و مسائل

دیہات میں نماز جمعہ اور مسلکِ حنفی

(۲)

یہی وجہ ہے کہ ان شرائط کے شرائطِ وجوب تو در کنار شرائط ادا ہونے میں بھی کلام کیا جاسکتا ہے، اور کیا گیا ہے۔ خود علمائے احناف نے وقتاً فوقتاً ان شرائط میں ترمیمیں کی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلک حنفی میں اتنی گنجائش ہے کہ حسب موقع و ضرورت، ان میں قواعد شرعیہ کو ملحوظ رکھ کر مزید ترمیم کی جاسکے۔

قابلِ ترمیم شرائط سب سے پہلے سلطان کی شرط کو لیجیے۔ امام شافعی رضی اللہ عنہ نے تو اسکے شرطِ جمعہ ہونے سے ابتدا ہی میں انکار کردیا تھا مگر خود فقہائے حنفیہ بھی بعد میں اس شرط کے اسقاط پر مجبور ہوگئے۔ جب تک ایسے سلاطین و امراء برسرِ اقتدار رہے جو کسی حد تک اپنے فرائضِ دینی کا احساس رکھتے تھے، اس وقت تک تو حنفیہ کو اپنے اس فتوے میں بظاہر کوئی قباحت نظر نہ آئی کہ "جمعہ کی اقامت اذن سلطان کیساتھ مشروط ہے اور سلطان کے بغیر اقامتِ جمعہ جائز نہیں" مگر جب دین سے غافل حکام و سلاطین کا دور آیا تو فقہاء نے محسوس کیا کہ شرط سلطان نے ایک دینی فرض کو دنیوی سلاطین کی مرضی پر موقوف کردیا ہے، حتیٰ کہ اگر وہ نہ چاہیں تو فرض ہی ساقط ہوا جاتا ہے۔ اسلیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ اگر حکام غفلت برتیں تو جمعہ مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے قائم کیا جائے۔ پھر وہ دور آیا جب اسلامی ممالک پر کفار مسلط ہونے لگے اور بڑی بڑی اسلامی

جماعتیں سلطانِ اسلام سے کلیتہً محروم ہو گئیں۔ اس وقت فقہاء کو یہ فتویٰ دینا پڑا کہ:

وأما في بلاد عليها ولاة كفار فيجوز للمسلمين إقامة الجمع والأعياد ويصير القاضي قاضياً بتراضي المسلمين ويجب عليهم طلب والٍ مسلم (شامی)

رہے وہ ممالک جن پر کافر حکام مسلط ہیں تو ان میں مسلمانوں کے لیے اقامت جمعہ وعیدین کا خود انتظام کر لینا جائز ہے اور وہاں مسلمانوں کی باہمی رضامندی سے جو قاضی مقرر ہو وہ قاضی ہو سکتا ہے، اور ان پر مسلمان حاکم کی طلب واجب ہے۔

اس طرح وہی شرط، جو پہلے شرطِ ادا تھی شرطِ وجوب بھی نہ رہی، اور تحقیق سے معلوم ہو گیا کہ سلطانِ اسلام کی موجودگی سرے سے شرط جمعہ ہی نہیں ہے۔ یہیں سے نبی اور مجتہد کا فرق واضح ہوتا ہے۔ نبی کی بصیرت براہِ راست علم الٰہی سے مستفاد ہوتی ہے اسلیے اس کے احکام تمام ازمنہ و احوال کیلیے مناسب ہوتے ہیں۔ مگر مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال ہو، زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا، نہ اسکی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے، لہذا اسکے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ جن لوگوں کو اللہ نے تفقہ فی الدین کی نعمت سے نوازا تھا وہ چوتھی صدی ہجری کے بعد بھی اس راز کو سمجھتے تھے اور تغیر احوال کیساتھ اپنے مذہبِ فقہی کے جزوی احکام میں مناسب ترمیم کر دیتے تھے، اور انکی ترمیمات، اجتہادی ترمیمات ہونیکے باوجود اسی سسٹم کا ایک جزو بن جاتی تھیں جسکے وہ متبع ہوتے تھے۔ مگر جو لوگ اس نعمت سے محروم ہیں، وہ مجتہد کی نص کو خدا اور رسول کی نص کی طرح محکم سمجھتے ہیں، اور اُسکی بنا پر وہ خدا اور رسول کے عائد کردہ فرائض کو مسلمانوں پر سے ساقط کر دینے میں بھی تامل نہیں کرتے۔

اسی قسم کے بعض جامد فقہاء نے انگریزی تسلط کے بعد ہندوستان میں فتوے دینے شروع کر دیے تھے کہ اب یہاں اقامت جمعہ جائز نہیں۔ کیونکہ سلطان اسلام کے اٹھ جانے سے اقامت

جمعہ کی ایک شرط مفقود ہو گئی ہے۔ مگر خوش قسمتی سے اس وقت ہندوستان میں ایسے علماء بھی موجود تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے علم حق سے سرفراز فرمایا تھا۔ انہوں نے اٹھ کر سختی کے ساتھ اس تحریک کی مخالفت کی، حتی کہ مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے زیادہ درشت الفاظ میں، یہاں تک لکھ دیا :۔

انہ لاشک فی وجوب الجمعة وصحتہ ادائھا فی بلاد الھند التی غلبت علیھا النصاریٰ وجعلوا علیھا ولاۃ کفارا وذلک باتفاق المسلمین وتراضیھم ومن افتیٰ بسقوط الجمعة لفقد شرط السلطان فقد ضل واضل۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بلاد ہند میں جہاں نصاریٰ کا غلبہ ہو گیا ہے اور انہوں نے کافر حکام مقرر کر دیے ہیں، جمعہ واجب ہے اور مسلمانوں کے باہمی اتفاق اور رضامندی سے اس کو ادا کرنا درست ہے۔ جس کسی نے سقوط جمعہ کا فتویٰ دیا وہ خود بھی گمراہ ہوا اور اس نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تمام ہندوستان کے حنفی، عالم اور عامی سب، اس ملک میں جمعہ پڑھ رہے ہیں، حالانکہ ہدایہ کی یہ عبارت اب بھی پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے کہ لا یجوز اقامتھا الا للسلطان او لمن امرہ السلطان۔ اگر احوال کے لحاظ سے مجتہدین کے احکام میں جزوی ترمیم کرنا بھی غیر مقلدیت ہے، تو ایسی غیر مقلدیت میں تمام احنافِ ہند پہلے ہی مبتلا ہو چکے ہیں۔

شرطِ مصر شرطِ سلطان کی طرح شرط مصر کو بھی امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ امر تو متفق علیہ ہے کہ جنگلوں اور خیموں اور عارضی فرودگاہوں میں جمعہ قائم کرنا درست نہیں۔ یہ امر بھی متفق علیہ ہے کہ جمعہ کیلیے ایک نوع کا تمدن ضروری ہے۔ مگر اس امر میں اختلاف ہے کہ جمعہ کتنی بڑی بستی میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ جس جگہ کم از کم چالیس آدمیوں کی مستقل بستی ہو (یعنی وہ گرمی جاڑے میں مہاجرت نہ کرتے رہتے ہوں)

وہ مقام اقامت جمعہ کا ہے۔ امام مالک کے نزدیک چالیس آدمیوں سے کم کی بستی میں بھی اقامت جمعہ ہو سکتی ہے۔ مگر حنفیہ کا مسلک یہ ہے کہ اقامت جمعہ کیلیے "مصر جامع" ہونا چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ "مصر جامع" کا لفظ تو نص میں آیا ہے۔ مگر جیسا کہ میں اوپر عرض کر چکا ہوں، اسکی کوئی حد، منصوص نہیں ہے۔ اسی لیے اس میں اجتہاد کی گنجائش ہے اور اجتہاد ہی سے مختلف زمانوں میں مختلف حدیں مقرر کی گئی ہیں، حتی کہ ایک ہی امام نے مختلف اوقات میں اس کی مختلف حدیں بیان کی ہیں۔

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ سے تین مختلف تعریفیں منقول ہیں:

(۱) مصر جامع وہ ہے جہاں امیر اور قاضی احکام اسلامی کی تنفیذ اور حدود شرعی کی اقامت کرتا ہو۔ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ سے بھی ایک قول اسی مضمون کا منقول ہے۔ اور کرخی وغیرہ فقہا نے اس کو اختیار کیا ہے۔

(۲) مصر وہ مقام ہے جسکے باشندے (یعنی وہ لوگ جن پر جمعہ فرض ہے) اگر سب کے سب وہاں کی سب سے بڑی مسجد میں جمع ہو جائیں تو وہ انکے لیے کافی نہ ہو اور ایک دوسری مسجد بنانے کی ضرورت پڑ جائے۔ اس رائے کو ابن شجاع نے پسند کیا ہے۔ اور ابو عبد اللہ الثلجی نے بھی اسکو اختیار کیا ہے۔

(۳) مصر وہ جگہ ہے جہاں کم از کم دس ہزار کی آبادی ہو۔

ظاہر ہے کہ یہ تینوں تعریفیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں، اور ایک ہی امام نے ان کو مختلف اوقات میں اختیار کیا ہے۔ پھر مختلف فقہاء نے اپنی پسند کے مطابق ان میں سے بعض کو رد اور بعض کو قبول کیا حالانکہ وہ مجتہد مطلق نہ تھے۔

امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ سے ایک قول تو وہ منقول ہے جو اوپر بیان ہوا۔ اور انہی سے دوسرا قول یہ روایت کیا گیا ہے کہ:

"مصر وہ ہے جہاں سڑکیں اور بازار ہوں، محلے ہوں، کوئی والی ظالم سے مظلوم کا انصاف لینے والا ہو اور کوئی عالم موجود ہو جس سے مسائل شرعیہ میں رجوع کیا جا سکے۔"[1]

اسطرح امام اعظم نے دو مرتبہ اور امام ابو یوسف نے تین مرتبہ مصر کی تعریف میں ترمیم فرمائی۔ اس کے بعد بھی مختلف لوگوں نے مختلف تعریفیں کیں اور ترمیمات کا سلسلہ جاری رہا مثلاً علامہ سرخسی لکھتے ہیں:

"ہمارے بعض مشائخ کا قول ہے (بلا اس تصریح کے کہ وہ مشائخ ہیں کون؟) کہ مصر وہ ہے جہاں ہر پیشے کا آدمی اسی مقام پر کام کر کے گذر بسر کر سکتا ہو، اور اسے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔"[2]

ایک اور تعریف برجندی نے کنز العباد سے نقل کی ہے کہ بعض فقہاء کے نزدیک:

"مصر وہ ہے جہاں ہر روز ایک بچہ پیدا ہو اور ایک آدمی مرے۔"

ایک اور تعریف کنز العباد میں کسی نامعلوم الاسم فقیہ سے نقل کی گئی ہے کہ:

"مصر وہ ہے جسکی مردم شماری بغیر انتہائی تکلیف اور سخت مشقت کے معلوم نہ کی جا سکے۔"

اسی قسم کی اور تعریفات کا سلسلہ قریب قریب ہر زمانے میں برابر جاری رہا ہے، حتیٰ کہ ہم سے بہت قریبی دور میں بھی مختلف علماء نے مختلف تعریفیں کی ہیں جنکی تعداد درجنوں سے متجاوز ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصر کی تعریف خود حنفیہ میں مختلف فیہ ہے، مصر کوئی متعین چیز نہیں ہے، اگر اسکی کوئی مزید تعریف کی جائے تو حنفیت سے خارج ہو کر غیر مقلدیت کے دائرے میں چلے جانے کا خطرہ نہیں ہے، اور سب سے زیادہ یہ کہ اگر حنفیہ ہی کے اصول پر معنی مصر کا تعین اسطرح

---

[1] ملاحظہ ہو، ہدایہ فتح القدیر و شرح العنایہ علی الہدایہ جلد اول صفحہ ۴۰۹ و ۴۱۰

[2] ملاحظہ ہو کتاب المبسوط جلد دوم صفحہ ۲۳ -

کیا جائے کہ اس سے اسقاطِ فرض کے بجائے اقامتِ فرض میں مدد ملتی ہو تو وہ اہلِ تقویٰ کیلیے زیادہ قابلِ قبول ہونا چاہیے۔

آخری تنقیح اب میں آخری تنقیح کی طرف توجہ کرتا ہوں جس پر مسئلے کے تصفیہ کا مدار ہے۔ اس تنقیح کے الفاظ پھر ایک مرتبہ ملاحظہ فرما لیجیے:

"کیا یہ جائز ہے کہ اس فرض کو ادا کرنے کیلیے ایک ایسا نظام اختیار کیا جا سکے جو فقہائے حنفیہ کے فتاویٰ سے چاہے مختلف ہو، مگر ان کے اصول کے خلاف نہ ہو؟"

اوپر جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس سے یہ تو صاف ظاہر ہے کہ ایسا کرنا جائز ہے۔ اگر شرطِ سلطان کو بالکل ساقط کر دینے، اور مصر کی تعریفات میں پے در پے ترمیمات کرنیکے باوجود حنفیت کے دائرے سے کوئی شخص خارج نہیں ہوتا، تو کوئی وجہ نہیں کہ اس مذہب کے دائرے میں ادائے فرض کسی ایسے نظام کی گنجائش نہ ہو، جو اصول مذہب حنفی پر پورا اترتا ہو۔ لہذا اب مجھ پر صرف اس امر کا بارِ ثبوت رہ جاتا ہے کہ جو نظام میں تجویز کر رہا ہوں وہ اصولِ مذہب حنفی کے مطابق ہے۔

میں نے جہاں تک احکام پر غور کیا ہے، اس سے مجھے شریعت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ نماز جمعہ کو منتشر طور پر چھوٹے چھوٹے قریوں میں الگ الگ ادا کرنا مقاصد جمعہ کیلیے مفید نہیں ہے، اسلیے شارع نے حکم دیا کہ جمعہ "مصر جامع" میں قائم کیا جائے۔ "مصرِ جامع" کا لفظ خود اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس سے مراد کوئی ایسی بستی ہے جو چھوٹی چھوٹی جماعتوں کو یکجا کرنے والی، یا جامع الجماعات ہو، یعنی جہاں بہت سی چھوٹی بستیوں کے لوگ اکٹھے ہو کر جمعہ ادا کریں۔ اس غرض کیلیے دوکانوں اور بازاروں، اور آبادی کی تعداد، اور ایسی ہی دوسری چیزوں کو مصر کی جامعیت میں کوئی دخل نہیں ہے، نہ اقامت جمعہ سے ان اجزائے مصر کا براہِ راست کوئی تعلق ہے کہ جمعہ کی نماز اپنی صحت کیلیے بازار اور بہت سی دوکانیں مانگتی ہو۔ اسکے لیے تو صرف ایسی بستی کی ضرورت ہے جو مرکزی حیثیت

رکھتی ہو تاکہ اطراف کے منتشر مسلمان وہاں مجتمع ہو جائیں۔ اگر کوئی بڑا شہر موجود ہو، جسے تمدن نے خود ہی ایک مرکزی حیثیت دے رکھی ہو تو بہت اچھا، ورنہ امامِ وقت جس بستی کو مناسب سمجھے "مصر جامع" قرار دے کر اطراف کے لوگوں کو وہاں جمع ہونے کا حکم دے سکتا ہے۔ چنانچہ علامہ ابن ہمام فتح القدیر میں لکھتے ہیں کہ ولو مصر الامام موضعا وامرھم بالاقامة فیه جاز ولو منع اھل مصر ان یجمعوا لم یجمعوا، یعنی" اگر امام کسی جگہ کو مصر ٹھیرا دے اور لوگوں کو وہاں جمعہ قائم کرنے کا حکم دے تو وہاں نماز جائز ہے، اور اگر کسی مقام کے باشندوں کو جمعہ قائم کرنے سے منع کر دے تو ان کو قائم نہ کرنا چاہیے" (جلد اول صفحہ ۴۰۹) لیکن اگر امام موجود نہ ہو تو جس طرح مسلمانوں کی تراضی سے جمعہ قائم ہو سکتا ہے، اور جس طرح انکی تراضی سے قاضی مقرر ہو سکتا ہے، اسی طرح انکی تراضی، امام کی قائم مقام بن کر کسی بستی کو "مصر جامع" بھی ٹھیرا سکتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس میں کونسی نص مانع ہے، یا یہ بات اصول میں سے کس اصل کے خلاف پڑتی ہے۔

مصر جامع کی شرط لگانے سے شارع کا منشا تو یہ تھا کہ دیہات کے لوگ فریضۂ جمعہ کو منتشر طور پر ادا کرنے کے بجائے ایک مرکزی مقام پر مجتمع ہو کر ادا کریں۔ مگر نہ معلوم کن وجوہ سے اس شرط کے معنی بالکل الٹ دیے گئے، اور دیہات کے لوگوں کو اجتماع کا حکم دینے کے بجائے، الٹا فریضۂ جمعہ ہی سے سبکدوش کر دیا گیا۔ غالباً اسکی وجہ یہ ہوئی کہ لفظِ "مصر" سے علماء کا ذہن "شہر" کے عرفی مفہوم کی طرف منتقل ہو گیا، اور انہوں نے حدیث کا مطلب یہ سمجھا کہ جمعہ صرف شہروں میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ پھر چونکہ شہر بہت دور دور ہوتے ہیں، اور مسافت بعید طے کر کے ان کی طرف جانے سے آدمی مسافر کی تعریف میں آجاتا ہے، جس پر جمعہ از روئے نص فرض ہی نہیں ہے، اس لیے بات یہاں تک پہنچ گئی کہ مضافات شہر کے سوا باقی تمام دیہات کے باشندوں پر سے فریضۂ جمعہ ساقط ہے۔ حالانکہ جس چیز کو قرآن اور احادیث مشہورہ، اور سنت و اجماع نے مسلمانوں

پر فرض عین ٹھیرایا ہو اسے دیہات کے رہنے والے کروڑوں مسلمانوں کیلیے غیر فرض بنا دینا اور وہ بھی ایک مختلف فیہ اور مبہم المعنی حدیث کی بنا پر، کسی طرح مقتضائے احتیاط نہیں ہے۔ حدیث نے تو اقامت جمعہ کیلیے محض "مصر جامع" کی شرط لگائی ہے۔ مردم شماری کی ایک خاص مقدار اور دوکانوں کی ایک خاص تعداد اور ایسی ہی دوسری چیزوں کی تصریح اس میں نہیں ہے۔ لہذا یہ چیزیں بجائے خود اقامت جمعہ کیلیے شرطِ منصوص نہیں ہیں، بلکہ ان کو اس مفہوم نے شرط بنایا ہے جو لفظِ مصر سے علماء نے سمجھا، با با لفاظ دیگر فریضۂ منصوصہ کو دیہات کے مسلمانوں پر سے ساقط کرنے والی چیز خود نص نہیں ہے، بلکہ وہ مفہوم ہے جو نص سے اخذ کیا گیا ہے۔ اگر اس مفہوم کے سوا نص کا کوئی اور مفہوم نہ ہوتا، یا نص اپنے الفاظ میں صریح ہوتی، تو بلاشبہ اس کی بنا پر اسقاطِ فرض درست ہوتا۔ مگر جبکہ اس کا کوئی دوسرا مفہوم بھی ہو سکتا ہے، تو میرے نزدیک تقویٰ اور خشیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اسقاطِ فرض کا راستہ کھولنے والے مفہوم کی بہ نسبت، اقامتِ فرض کا راستہ کھولنے والا مفہوم زیادہ لائق ترجیح ہے۔

میں نے مصر کی جو تعریف کی ہے، اس کو اختیار کرنے سے قریب قریب ہر دیہاتی مسلمان، بلکہ خانہ بدوش مسلمان کیلیے بھی صحیح شرعی طریق پر جمعہ ادا کرنا ممکن ہو جاتا ہے۔ اسکی صورت یہ ہے کہ دیہی علاقوں کو چھوٹے چھوٹے حلقوں میں تقسیم کیا جائے جن کا دور ۵ سے ۸ - ۹ میل تک ہو۔ ان حلقوں میں ایک مرکزی مقام کو مسلمان باشندوں کی باہمی رضامندی سے مصر جامع قرار دیا جائے، اور وہاں سے آٹھ آٹھ نو نو میل تک کے دیہات کو توابع مصر قرار دیکر اعلان کر دیا جائے کہ ان کے مسلمان باشندے وہاں آکر جمعہ کی نماز ادا کریں۔ یہ نظام نہ صرف احادیث صحیحہ کی رو سے بلکہ فقہاء حنفیہ کی تصریحات سے بھی بالکل ایک صحیح نظام ہوگا۔ فقہائے نے توابع مصر کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ بعض لوگوں نے توابع مصر کی حد ۹ میل مقرر کی ہے، بعض نے دو میل

بعض نے ۶ میل، اور بعض کہتے ہیں کہ "جس مقام سے مصر میں آکر نماز ادا کرنیکے بعد آدمی رات ہونے سے پہلے پہلے اپنے گھر پہنچ سکے وہ توابع مصر میں شمار ہوگا" صاحب بدائع نے اسی تعریف کو پسند کیا ہے، اور حدیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ ترمذی میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے:

عن النبی صلعم قال الجمعة علی من آواہ اللیل الی اهله	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جمعہ اس پر فرض ہے جو نماز پڑھ کر رات سے پہلے اپنے گھر پہنچ سکے۔

اور بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے:۔

کان الناس ینتابون الجمعة من منازلهم والعوالی	لوگ جمعہ کے روز اپنی فرودگاہوں اور عوالی سے آیا کرتے تھے۔

اور ایک دوسری حدیث میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے:۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الا هل عسی احدکم ان یتخذ الصبة من الغنم علی رأس میل او میلین فیتعذر علیه الکلاء فیرتفع ثم تجیئ الجمعة فلا یجیئ ولا یشهدها (ثلاثا) حتی یطبع علی قلبه	حضور نے فرمایا کہ سنو! تم میں سے ایک شخص بکریوں کا ریوڑ لیے ہوئے چارے کی تلاش میں تو میل دو میل چلا جائے مگر جب جمعہ آئے تو اس میں شریک ہونے کیلیے یہاں نہ آئے۔ (یہ جملہ آپ نے تین مرتبہ دہرایا، پھر فرمایا) ایسے شخص کے دل پر مہر لگائی جائیگی۔

ان احادیث سے اور فقہاء کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ توابع مصر کی حد چھ سات میل یا اسکے قریب قریب ہے، جہاں کے باشندے نماز پڑھ کر شام تک اپنے گھر پہنچ سکیں،

اور اس حد کے اندر رہنے والے تمام مسلمانوں پر، خواہ وہ مستقل دیہات میں رہتے ہوں، یا خانہ بدوش ہوں، مصر جامع میں حاضر ہو کر نماز جمعہ ادا کرنا فرض ہے، جیسا کہ ابن ہمام نے فتح میں لکھا ہے کہ:

ومن کان من مکان من توابع المصر فحکمہ حکم اھل المصر فی وجوب الجمعۃ علیہ بان یاتی المصر فلیصلھا فیہ (جلد اول صـــ ۴۱۱)	اور جو شخص توابع مصر میں سے کسی جگہ ہو اس کے لیے خود اہلِ مصر کی طرح جمعہ واجب ہے، اسے مصر میں حاضر ہو کر نماز ادا کرنی چاہیے۔

خلاصۂ کلام اب میں اپنے مدعا کی تسہیل کیلیے مناسب سمجھتا ہوں کہ پچھلے مباحث کا ایک خلاصہ آپکے سامنے پیش کردوں، تاکہ بیک نظر آپ کو معلوم ہو جائے کہ اقامت جمعہ فی القریٰ کیلیے جو نظام میں تجویز کر رہا ہوں وہ کہاں تک مسلک حنفی کے خلاف یا موافق ہے۔

۱- حنفیہ کے نزدیک الگ الگ دیہات میں جمعہ قائم کرنا جائز نہیں ــــ میں بھی اسی کا قائل ہوں۔

۲- حنفیہ کی رائے میں جمعہ صرف "مصر جامع" میں قائم ہونا چاہیے ــــ میں اس امر میں بھی ان کا متبع ہوں۔

۳- حنفیہ صرف دو قسم کے مقامات کو مصر جامع تسلیم کرتے ہیں۔ ایک وہ جن کو تمدن نے خود بخود جامع بنا دیا ہو، جیسے شہر اور قصبے۔ دوسرے وہ جن کو امامِ وقت جمعہ قائم کرنیکے لیے مصر ٹھیرا دے ــــ اس میں صرف اتنی ترمیم میں نے تجویز کی ہے کہ فقدانِ امام کی وجہ سے عامۂ مسلمین کے اتفاق کو امام کا قائم مقام قرار دیا جائے، اور انکے اس اختیار کو تسلیم کیا جائے کہ وہ کسی علاقہ میں کسی مقام کو مصر جامع قرار دے لیں۔ چونکہ اقامت جمعہ کے معاملہ میں حنفیہ نے مسلمانوں کی تراضی کو امام کا

قائم مقام تسلیم کیا ہے، لہذا کوئی وجہ نہیں کہ تعیین مصر کے معاملہ میں ایسا کرنا حنفیہ کے اصول کے خلاف سمجھا جائے۔

۴- حنفیہ نے اہلِ قریٰ کے حق میں جمعہ کی عدم فرضیت کا حکم صرف اس لیے لگایا ہے کہ امرا و سلاطین نے اقامت جمعہ کیلیے کوئی نظام قائم کرنے سے بے پروائی برتی، جسکی وجہ سے جمعہ محض پہلی قسم کے امصار جامعہ، یعنی شہروں اور بڑے بڑے قصبوں تک محدود ہو کر رہ گیا، اور چونکہ شہر روز دور ہوتے ہیں، اسلیے مجبوراً حنفیہ کو یہ فتویٰ دینا پڑا کہ دیہات کے باشندوں پر جمعہ فرض نہیں۔ ورنہ یہ ظاہر ہے کہ دیہاتی کا محض دیہاتی ہونا، اُس پر سے جمعہ کے ساقط ہونے کا سبب نہیں ہے۔ چنانچہ جو دیہات توابع مصر میں ہوں، یعنی "مصر" سے سات آٹھ یا نو میل کی حد میں ہوں، ان پر حنفیہ کے نزدیک جمعہ اسی طرح فرض ہے جس طرح اہلِ مصر پر فرض ہے۔
میں کہتا ہوں کہ جو فتویٰ اس مجبوری کی بنا پر دیا گیا ہے، اسکے سبب کو دور کرنا ہم پر لازم ہے تاکہ سبب زائل ہونیکے ساتھ فتویٰ خود بخود زائل ہو جائے اور مسلمانوں کیلیے ایک فرضِ مکتوب کے ادا کرنیکا راستہ کھلے۔ بخلاف اس کے بعض علما فرماتے ہیں کہ سبب کو قائم رکھو تاکہ وہ پرانا فتویٰ جو قدامت کی وجہ سے مقدس ہو چکا ہے، اٹل رہے، چاہے فرضِ مکتوب کی رحمتوں سے کروروں مسلمان محروم ہو جائیں۔

تغیر فتویٰ کی دینی ضرورت بحث کے اس خلاصہ کو دیکھ کر بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اقامت جمعہ کا جو نظام میں تجویز کر رہا ہوں، اسکے لیے مذہب حنفی میں پوری گنجائش موجود ہے، اور اسے ناجائز ٹھیرانے کیلیے حقیقتہً کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔ اب میں مختصراً یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس قسم کا ایک نظام تجویز کرنے کی ضرورت کیا پیش آئی ہے، اور شرعی نقطۂ نظر سے اس ضرورت کی اہمیت کیا ہے۔

ہندوستان میں جب تک مسلمانوں کی حکومت تھی، خواہ وہ شرعی حیثیت سے کتنی ہی ناقص ہو، بہر حال اسکی وجہ سے اسلام کا اجتماعی نظام کسی نہ کسی حد تک ضرور قائم تھا۔ کم از کم اتنا تو تھا کہ اسلامی قوانین مسلمان حاکموں کے ذریعہ سے نافذ ہوتے تھے، اور ہماری قوم کے عوام و خواص شہری اور دیہاتی اپنی زندگی کے معاملات میں انکی طرف رجوع کرتے تھے۔ افرادِ امت کو ایک دینی سر رشتہ سے وابستہ رکھنے کا یہ ایک قوی ذریعہ تھا۔ مگر جب وہ نیم اسلامی حکومت بھی ختم ہوگئی تو امت کو باہم مربوط رکھنے کیلیے کوئی نظام باقی نہ رہا۔ اب لے دے کر ہماری جمعیت، بلکہ حیاتِ ملی کا تمام تر انحصار اُن روابط پر رہ گیا ہے جو عقائد، عبادات اور تمدن و معاشرت کے شرعی قوانین سے پیدا ہوتے ہیں۔ انہی کی طاقت سے ہماری طاقت ہے، ان کی کمزوری ہماری کمزوری ہے، اور انکی موت ہماری موت ہے۔ ابھی تک بیشمار مخالف اسباب کی کارفرمائی کے باوجود شہروں میں یہ روابط نسبتہً کافی طاقتور ہیں، مگر دیہات میں مسلمانوں کی جو چھوٹی چھوٹی منتشر آبادیاں لاکھوں میل کے رقبہ پر پھیلی ہوئی ہیں، اُن کو دینی رابطہ میں جوڑنیوالا سر رشتہ اب اس درجہ کمزور ہو چکا ہے کہ ایک اشارہ میں ٹوٹ سکتا ہے۔ وہ منتشر بھیڑوں کیطرح ہر گمراہ کن بھیڑیے کیلیے آسان شکار بن گئے ہیں، اور جہاں وہ قلیل التعداد ہیں، وہاں تو انکی جان و مال اور عزت و آبرو تک محفوظ نہیں۔ اس صورت حال کی اصلاح اگر جلدی نہ کی گئی تو آپ دیکھینگے کہ دیہات کی مسلمان آبادیاں فوج در فوج امت سے کٹتی چلی جائینگی اور ان کا کٹ جانا گویا امت کا ختم ہو جانا ہے، کیونکہ ہماری آٹھ کروڑ کی آبادی میں سے کم از کم ساڑھے چھ کروڑ افراد دیہات میں آباد ہیں۔

اب اگر محض غیر قوموں کی تقلید کرنی ہو تو دیہات سدھار کے بہت سے پروگرام بن سکتے ہیں، اور بن ہی رہے ہیں، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایسے کسی پروگرام سے اسلامی جمعیت اور دینی شیرازہ بندی ممکن نہیں۔ اسلامی جمعیت تو صرف رابطۂ دینی ہی کو مضبوط کرنے سے پیدا ہو سکتی ہے، اور اسکو مضبوط کرنیکے جتنے طریقے ہیں اُن میں سے کوئی بھی اسوقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جبتک کہ دیہات میں اقامتِ جمعہ کا نظام قائم نہ کر دیا جائے۔ دینی اصلاح و تنظیم کی راہ میں پہلا قدم، منتشر افراد اور پراگندہ ٹکڑیوں میں دین کے واسطہ سے ربط و مرکزیت پیدا کرنا ہے اور اس ربط و مرکزیت کو پیدا کرنیکی